عہدِ حاضر کی ضرورت: ایران سے مفاہمت

تحریر: رے تکیے*

ترجمہ: محمد اکبر بابا

ابھرتا ستارا

بش انتظامیہ نے مشرق وسطیٰ میں حالات کی تبدیلی کا جو عہد کیا تھا آج اس کو پانچ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے اور دیکھا جائے تو حالات قرار واقعی بہت تبدیل ہوئے ہیں مگر منفی انداز میں۔ واشنگٹن کی عراق میں پے در پے ناکامیاں، اسرائیلی طاقت کی لبنان سے شرمناک پسپائی، ایک غیر اہم (معمولی) شیعہ جماعت کا غلبہ اور خطے کی اسلامی جماعتوں کا عروج (شہرت)، ایسے حالات و واقعات ہیں جنہوں نے خطے کو انتشار اور انارکی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

اس تمام تر گھمبیر صورت حال میں اسلامی جمہوریہ ایران کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ایران کی حکومت نے نہ صرف اپنے خلاف تمام امریکی حربے ناکام کر دیے بلکہ مشرق وسطیٰ کے خطے میں ایران کے اثر و رسوخ میں بھی بیش قدر اضافہ کیا ہے۔ عراق اور لبنان میں خانہ جنگی شروع ہونے سے لے کر خلیج فارس میں تحفظ کے معاملات تک ایران کو خطے کے تمام بڑے مسائل میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اور اس کے تعاون کے بغیر ان تمام مسائل کا حل ناقابل تصور ہے۔ دریں اثناء جوہری پروگرام کی بدولت ایران کی اپنی طاقت میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بین الاقوامی برادری کے تمام

---

* رے تکیے کاؤنسل آن فارن ریلیشنز میں سینئر فیلو ہیں۔ زیر مطالعہ مضمون فارن افیئرز کے مارچ - اپریل ۲۰۰۷ء کے شمارے سے لیا گیا ہے۔

تر احتجاج کے باوجود یہ جوہری پروگرام بغیر کسی رکاوٹ کے مسلسل آگے بڑھ رہا ہے جس نے امریکہ کو ایک عجیب مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ایران میں شاہ کا تختہ الٹنے اور اسلامی انقلاب کے بعد سے امریکہ کا ایران کی طرف حکمتِ عملیوں کا ایک بے ربط تسلسل شروع ہو گیا۔ کبھی امریکہ ایران کی حکومت تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے لیے وہ طاقت کے استعمال کی دھمکی بھی دیتا ہے اور اور کبھی چھوٹے چھوٹے تنازعات پر مذاکرات کو ترجیح دیتا ہے۔ جبکہ ایران کو پٹاری میں بند رکھنے اور خطے میں اس کے اثر ورسوخ کو کم کرنے کی سوچ اس کی حکمت عملی کا ایک مستقل حصہ ہے۔ مگر ابھی تک اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ بالخصوص ''روکنے کی پالیسی'' میں جو کہ اس وقت بھی ترجیحات میں شامل ہے۔

اگر امریکہ ایران کو سدھانا چاہتا ہے تو اسے اپنی ایران پالیسی از سر نو وضع کرنا ہوگی۔ نہ تو اسلامی جمہوریہ کا استیصال ممکن ہے اور نہ اس کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو کم کرنا آسان ہے۔ چنانچہ واشنگٹن کو کھلم کھلا فوجی قوت کے استعمال کی دھمکیوں، مشروط مذاکرات، اور ایران کو روکے رکھنے کی پالیسی جیسی چیزوں کو ایران کے ساتھ ''مفاہمت'' کے حق میں ترک کرنا پڑے گا۔ اس ضمن میں تہران میں موجود حقیقت پسندوں کو امریکہ کے ساتھ سفارتی اور معاشی تعلقات کو معمول پر لانے کی دعوت دینی چاہیے۔ اس طرح امریکہ کے ساتھ نئے تعلقات استوار کرنے کی امید سے سرشار یہ حقیقت پسند گروہ اس قابل ہوگا کہ انتہا پسندوں کو تہران سے نکال باہر کرے اور طاقت کا توازن اپنے حق میں کر لے۔ امریکہ جتنی جلدی اس حقیقت کا ادراک کر لے اور مفاہمت کی طرف بڑھے اتنا ہی اچھا ہے۔

کوئی بہتر راستہ نہیں

جب بھی ایران زیر بحث آتا ہے صدر بش اس بات پر ہمیشہ زور دیتے ہیں کہ ''تمام تجاویز زیر غور ہیں'' جس کا مقصد ایران کو یہ تلخ حقیقت یاد دلانا ہے کہ اگر تمام کوششیں ناکام ہو جائیں تو امریکہ ایران کے خلاف طاقت کا استعمال بھی کر سکتا ہے۔ ممکنہ امریکی حملے سے بچانے کے لیے ایران نے اپنی جوہری تنصیبات کو زیر زمین انتہائی گہرائی میں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جگہ جگہ پھیلا رکھا ہے۔ اس طرح امریکہ کو دو قسم کی آزمائشوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک سراغ رسانی کے

متعلق کہ کیسے ان جگہوں کا صحیح پتا لگایا جائے اور دوسرا اس سے بھی انتہائی کٹھن یعنی فوجی نقل وحمل اور ان ٹھکانوں کو کیسے صحیح صحیح نشانہ بنایا جائے۔ (عراق جنگ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ امریکی سراغ رساں ادارے اتنے قابل بھروسہ نہیں جتنا کہ انہیں ہونا چاہیے) اور پھر ایک کامیاب حملہ بھی ایرانی ملاؤں کی جوہری طاقت بننے کی خواہش کو ختم نہیں کر سکے گا بلکہ انہیں تعمیر نو کا جذبہ فراہم کرے گا اور وہ جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کام کرتے رہیں گے۔

جہاں تک مشروط مذاکرات کا تعلق ہے تو وہ کبھی منطقی انجام تک نہیں پہنچ سکے۔ مئی ۲۰۰۶ء میں ایک بار ایسا محسوس ہوا کہ حالات نے ایک نئی کروٹ لی ہے، جب کونڈالیزا رائس نے اعلان کیا کہ امریکہ ایران کے ساتھ کثیر فریقی مذاکرات میں شمولیت کے لیے راضی ہو سکتا ہے بشرطیکہ ایران یورینیم کی افزودگی ترک کر دے۔ اس بیان سے یہ تاثر لیا گیا کہ امریکہ اور ایران کے درمیان جھگڑے کی بنیاد محض (ایران کو) غیر مسلح کرنے کا مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایران اور امریکہ کے درمیان پائے جانے والے سیاسی اور تزویراتی اختلافات انتہائی غیر سطحی نوعیت کے ہیں اور ان کے حل کے لیے ایک جامع حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔

ان تلخ حقائق کے پیش نظر امریکی ماہرین کا جھکاؤ ''روکے رکھنے کی پالیسی'' کی طرف ہے جو نسبتاً کم قابل اعتراض تدبیر ہے۔ ان کے مطابق ایرانی مذموم عزائم کا صحیح توڑ سفارتی دباؤ اور معاشی پابندیوں کے صحیح اور درجہ بدرجہ نفاذ میں ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جو بالآخر تہران میں ایسی حکومت لا سکتا ہے جو صحیح طور پر جمہوری بھی ہو اور امریکی مفادات کی پاسداری بھی کرے۔

ایران کا سفارتی اور معاشی گھیراؤ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ اسلامی جمہوریہ کے وجود میں آتے ہی کسی نہ کسی شکل میں یہ نظریہ امریکی پالیسی کا ایک مستقل جزو بن گیا تھا اور اسے امریکہ کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی حمایت بھی حاصل رہی ہے۔ تاہم اس کے مؤثر نفاذ اور اسے نتیجہ خیز بنانے کے لیے چند اہم پہلوؤں پر سوچنا ضروری ہے۔ کیا ایسے ملک کو روکا جا سکتا ہے جو در پردہ دہشت گردی کی معاونت کرنے، بیرون ملک گروہوں کے ذریعے جنگیں لڑنے اور غیر ملکی شیعہ جماعتوں سے تعلق و

روابط رکھنے جیسے بالواسطہ ہتھکنڈوں کا استعمال کرتا ہو اور کیا خطے کے دوسرے ممالک ایران کو ''تنہا'' کرنے میں امریکہ کا ساتھ دیں گے؟

دراصل روکنے کی پالیسی کبھی کامیاب ہوئی ہی نہ تھی اور نہ ہی مستقبل میں اس کے کارآمد ہونے کی کوئی امید ہے۔ اس کی ناکامی کے ثبوت حکومت کی فائلوں میں بھرے پڑے ہیں جن میں ایران کی طرف سے جاری دہشت گردی کی معاونت اور اس کے جوہری منصوبے میں توسیع وترقی کی داستانیں تفصیل کے ساتھ رقم ہیں۔ ابھی تک معاشی پابندیاں اور سیاسی وسفارتی دباؤ ایرانی رویے کو تبدیل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

بش انتظامیہ نے حال ہی میں چند ایسے اقدامات کیے ہیں جنھوں نے ایران کے گھیراؤ کی حکمت عملی کو مزید کمزور کر دیا ہے، مثلاً امریکہ نے کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عراق پر چڑھائی کی جس نے ان عراقی شیعہ جماعتوں کو تقویت دی جن کا جھکاؤ ایران کی طرف تھا۔ اس سارے معاملے کا فائدہ بالآخر ایران کو ہی ہوا۔ ایران میں شیعہ طاقت کے سدباب کے لیے عراق میں سنی طاقت ور حکومت کا ہونا اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ عراق کے تمام شیعہ ایرانی شیعوں کے ہم نسل نہ بھی سہی مگر برسراقتدار شیعہ جماعتیں ایران کی حامی ضرور ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ عراقی رہنما اپنے مفادات پر ایران کے مفادات کو ترجیح دیں گے تاہم یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ امریکہ کی ایماء پر ایران کے خلاف نہیں اٹھیں گے۔ مزید برآں خطے کا کوئی اور (دوسرا) ملک بھی آج امریکہ کے لیے ایران سے ٹکر لینے کو تیار نہیں۔

خلیج فارس کی عرب ریاستوں کی یہ روایت رہی ہے کہ وہ پہلے برطانیہ اور پھر امریکہ سے تحفظ کی ضمانت لیتی رہی ہیں اور انہیں طاقتوں کی مرہون منت ان خلیجی ریاستوں کو اپنے طاقتور ہمسایہ ملک ایران کے مقابلے میں کسی حد تک آزادی میسر رہی، مگر امریکہ کے تضحیک آمیز رویے اور عراق میں امن وامان بحال کرنے میں ناکامی کے باعث ان ریاستوں کے امریکہ پر اعتماد کو ٹھیس پہنچا ہے۔ عوام الناس میں پائے جانے والے امریکہ مخالف جذبات نے مقامی حکومتوں کے لیے امریکہ کے ساتھ

تعاون یا امریکی فوجوں کو اپنی زمین استعمال کرنے کی اجازت دینا مشکل بنا دیا ہے۔ امریکہ کھلے سمندر میں اپنے بحری بیڑے یا کویت جیسے فرمانبردار ملک میں اپنی فوج تو رکھ سکتا ہے مگر خطے میں اپنی بھاری فوج رکھنا اس کے لیے اب ممکن نہیں۔ اب ایسے لگتا ہے کہ خلیج فارس کی ریاستوں کا ایرانی جوش وولولے میں زیادہ یقین ہے اور جیسے جیسے ایران کی طاقت اور خطے میں اس کے اثر ورسوخ کا اضافہ ہوتا جائے گا یہاں کے فرمانروا ایران کے ساتھ تعلقات کو امریکہ پر ترجیح دینا شروع کر دیں گے۔

عالمی برادری بھی ایران کے معاملہ میں کسی حد تک لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ سال بش انتظامیہ نے ایران کے خلاف چند کامیابیاں حاصل کی تھیں مگر یہ کامیابیاں برائے نام ہیں۔ ان علامتی کامیابیوں کے باوجود صرف چند ایسی بڑی طاقتیں ہیں جو ایران پر سخت پابندیاں لگانے میں امریکہ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ ان کے مطابق ایران کا جوہری پروگرام اور دہشت گردوں کی پشت پناہی تشویش ناک تو ہیں مگر ان کا تصفیہ فوجی قوت کے استعمال کے بغیر بھی ممکن ہے۔

یہ اس لیے نہیں کہ فرانسیسی کم ہمت ہیں یا روسی بداطوار ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ ان کے نزدیک ایران کوئی بڑا اور فوری خطرہ نہیں ہے۔ سرد جنگ کے دنوں میں امریکہ سوویت یونین کے خلاف تعاون حاصل کر سکا کیونکہ امریکہ کی طرح دوسرے مغربی ممالک کو بھی اس سے (سوویت یونین) سے خطرہ تھا لیکن ایران کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اسرائیل کے علاوہ چند ہی ممالک ہوں گے جنہیں ایران سے کوئی خطرہ ہو۔

یاد رکھنے والا معاملہ

امریکہ کو ایک موثر ایران پالیسی تشکیل دینے سے پہلے، ایران کا خطے کی بڑی قوت بننا اور اس کی حکومت کی ثابت قدمی جیسے چند حقائق کو دل سے تسلیم کرنا ہوگا اور پھر یہ سوچنا ہوگا کہ ان حقائق کو کیسے اپنی حکمت عملی کا حصہ بنایا جائے۔ اسلامی جمہوریہ ایران چاہے کتنے ہی بڑے بڑے وعدے کرے اور جوش اور ولولہ دکھائے یاد رہے کہ یہ نازی جرمن نہیں۔ یہ ایک موقع پرست طاقت ہے جو خطے میں

بغیر کسی تصادم کے اپنا سکہ جمانا چاہتی ہے۔ ایران کو ایک ابھرتی ہوئی طاقت مانتے ہوئے اس کے ساتھ براہ راست مذاکرات شروع کرنے ہوں گے جن کا بنیادی مقصد ایران کے اثر ورسوخ کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور اس کے ساتھ افہام وتفہیم کے ساتھ رہنے کا تاثر دیتے ہوئے ایران کو حد سے تجاوز کرنے سے روکنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں امریکہ کو مفاہمت کی حکمت عملی اپنانی چاہیے کیونکہ یہی عہد حاضر کی ضرورت ہے۔

اگر چہ یہ بات عجب اور ناممکن معلوم ہوتی ہے مگر امریکہ کو اس کا اچھی طرح تجربہ ہے کہ ۶۰ کی دہائی میں جب ایشیا میں امریکہ کی طاقت کا زور ٹوٹ رہا تھا اور چین کا ہمسایہ ممالک میں اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا تب امریکہ نے چین کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور چین ہی کی مدد سے ویت نام کی جنگ کو ختم کرایا اور مشرقی ایشیا میں استحکام کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح نکسن انتظامیہ نے روس کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اپناتے ہوئے نہ صرف ماسکو کے ساتھ تصادم کو روکا بلکہ ہتھیاروں کی دوڑ جیسے نازک مسئلے کا بھی تصفیہ طلب حل نکالا۔

یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آج تہران مذاکرات کے لیے اتنا ہی تیار ہوگا جتنے کبھی روس اور چین تھے۔ مگر امید کی کرن ابھی باقی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں حالیہ تبدیلیوں اور ایران کے اندرونی معاملات نے تہران کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ایران کا خطے میں ایک بڑی طاقت بن کر ابھرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بالآخر اسے اپنے سب سے بڑے حریف کے ساتھ تعلقات میں تبدیلی لانی ہوگی اسے یا تو امریکہ کے ساتھ ہم آہنگی سے رہنا ہوگا یا پھر محاذ آرائی پر اترنا پڑے گا۔

علاوہ ازیں ایران نے ہمیشہ جامع مذاکرات کو اہمیت دی ہے۔ امریکہ اور یورپی یونین کی جانب سے پچھلے سال موسم گرما میں مذاکرات کی حالیہ پیشکش کے جواب میں تہران نے اس بات پر زور دیا تھا کہ خطے میں استحکام اور لمبے عرصے کے لیے توانائی کی ضمانت کے حصول کے لیے ایران دفاعی، معاشی، سیاسی اور توانائی کے شعبوں میں تعاون کے لیے تیار ہے۔ ایران کا موقف یہ تھا کہ ان تنازعات کے مستقل حل کے لیے ان بنیادی وجوہات کا بھی خاتمہ کرنا ہوگا جو حالات کی پیچیدگی

کا باعث بنی ہیں۔

اس پیچیدہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے امریکہ کو بھی تہران میں حالیہ تبدیلیوں کو سمجھنا ہوگا۔ مثلاً ایران کو ایسی خارجہ پالیسی کی ضرورت ہے جو مشرق وسطیٰ میں بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت رکھتی ہو۔ حکومت میں دائمی گروہ بندی، اور (شاید سب سے اہم) تہران میں قائدین کی نئی پود کا آنا ایسے چند معاملات ہیں جنہوں نے حکومتی حلقے میں ایک نئی بحث کو جنم دیا ہے۔

ایسے حالات میں اگر امریکہ صحیح چال کے ساتھ صحیح پتا کھیلے تو ان معاملات میں ایک اہم ثالث کی حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔ مغربی ممالک ایران کی اندرونی سیاست کو انتہا پسندوں اور حقیقت پسندوں کے درمیان تصادم کے طور پر دیکھتے ہیں۔ سابق صدر ہاشمی اور رہبر معظم علی خامنہ ای کے درمیان اقتدار کے حصول کی جنگ اور وقتاً فوقتاً اصلاحات کی تحریک سے انہیں لگتا ہے کہ ایران میں بالآخر جمہوریت کو جگہ مل جائے گی۔ مگر یہ تجزیہ نگار اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ تہران میں حالات بدل چکے ہیں۔ ایرانی سیاست کے خدوخال ابھرتے ہوئے نوجوان قدامت پسندوں کے زیر اثر تبدیل ہو رہے ہیں۔ حتمی فیصلے کا حق ابھی بھی بزرگان انقلاب کے ہاتھ میں ہے جو کہ اپنے ان شاگردوں کے اقدامات سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ اب مقابلہ دائیں بازو اور بائیں بازو کے درمیان نہیں بلکہ پرانی اور نئی نسل کے درمیان ہے۔ ان کا لائحہ عمل اپنے پیش رو سے قطعی مختلف ہے یہ نئے رہنما بشمول احمدی نژاد نہ تو برملا امریکہ کے وفاداروں، مصر اور اردن کو ملامت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے تخت الٹانے کی سازش کر رہے ہیں۔ گویا ایران کے لیے ان ممالک کی اندرونی ساخت کے مقابلے میں خارجی تعلقات زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے ایرانی نظام حکومت کو عراقی سرزمین کی طرف برآمد کرنے سے بھی گریز کیا ہے۔ معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے صرف ایسے معاملات پر کام کیا ہے جو کہ عملی نوعیت کے تھے۔ حالانکہ ان کی خواہش ایک دوستانہ اور صلح جو ہمسائے کا حصول ہے مگر انہیں اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ ہے کہ عراقی شیعہ قیادت ایران کی خواہش کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرے گی۔ عراقی شیعہ جماعتوں کی حمایت کے پیچھے ان کا مقصد اپنی

وفادار شیعہ جماعتوں کو اقتدار میں لانے سے زیادہ مشتعل سنی جماعتوں کو اقتدار میں آنے سے روکنا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نئے قدامت پسند، ایران کے بین الاقوامی تعلقات میں معنی خیز تبدیلی نہیں چاہتے۔ اس کے برعکس اس وقت تہران میں یہ موضوع زیر بحث ہیں کہ خطے میں ایران کا دائرہ کار کیسے بڑھایا جائے۔ اور خطے میں اپنی متوقع بالادستی سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔ طالبان کی افغانستان سے بے دخلی، صدام کے خاتمے اور امریکہ کے عراق میں بری طرح الجھاؤ نے تجربہ کار رجعت پسندوں کو اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ ایران کے لیے خطے میں بالادستی حاصل کرنے کا وقت آ گیا ہے اور اب وہ ایران کو خطے کی ناگزیر قوم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔

ہماری بقا ''نفاق'' میں ہے

ایرانی سیاست کا یہ ایک خاصا ہے کہ بڑی جماعتوں میں گروہ بندی ہوتی ہے۔ نئے رجعت پسندوں میں بھی پھوٹ پائی جاتی ہے۔ ایران کا مفاد امریکہ کے ساتھ محاذ آرائی میں ہے یا پھر ہم آہنگی میں۔ یہ ایک ایسی بحث ہے جو انہیں آپس میں تقسیم کیے ہوئے ہے۔ ایک دھڑے میں صدر احمدی نژاد اور اہم عہدوں پر فائض دوسرے رہنما مرتضیٰ رضائی ڈپٹی کمانڈر اور مجتبیٰ ہاشمی نائب وزیر داخلہ جیسے بنیاد پرست ہیں جن کی طاقت کا اصل منبع پاسداران انقلاب (خصوصاً ان کا اطلاعات کا ادارہ) ہے اور دوسرے گروپ آبادگارانِ ایرانِ اسلامی اور جامعہ اسلامی مھندسین جیسے قدامت پرستوں کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ بزرگ مذہبی رہنما احمدی نژاد کے مذہبی دعویٰ استحقاق کو قبول نہیں کرتے تاہم وہ چند اہم مذہبی حلقوں میں اپنی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

ان قدامت پسندوں کی سیاسی سوچ کی پختگی ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کی بجائے اسّی کی دہائی میں لڑی گئی عراق جنگ کے باعث ہے جس نے ان کے دلوں میں امریکہ اور عالمی برادری کے خلاف نفرت بھر دی اور ان پر خود انحصاری کا خبط سوار ہو گیا۔

ان جنگجوؤں کے مطابق ایران کے مفادات کا تحفظ نہ بین الاقوامی معاہدوں کا احترام کرنے

میں ہے اور نہ مغربی ممالک کے آگے فریاد کرنے میں۔ بالخصوص احمدی نژاد اور اس کے اتحادی امریکہ کو ''شیطان اعظم'' سے تشبیہہ دیتے ہیں، جو ثقافت کی بگاڑ کا باعث بنتا ہے اور ایک غاصب ہے۔ ایک ایسا ساہوکار ہے جو ملکی وسائل کو لوٹتا ہے۔ ان کے خیال میں شاہ کی حکومت سے لے کر عراق کے حملے تک ایران پر آنے والی تمام آفتوں کی ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے اور پھر انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ امریکہ ایک انحطاط پذیر طاقت ہے۔ پاسداران انقلاب کے دستے کے کمانڈر جنرل حسین اسلامی کا کہنا ہے ''ہم نے واحد عالمی سپر پاور کی حتمی قوت کا اندازہ لگالیا ہے اور اس کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں''۔

احمدی نژاد کے مذہبی عقائد چاہے جتنے بھی پختہ ہوں وہ ظہور عیسیٰ کے لیے نئے عالمی نظام کی تیاری کے نظریے پر یقین نہیں رکھتا، لیکن وہ بحران زدہ ہمسایہ ممالک میں عوامی غم و غصے کو ابھار کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش ضرور کر رہا ہے۔ عراق میں کشت وخون، اسرائیل اور فلسطین کے مابین امن مذاکرات کے جمود، عرب رہنماؤں کا امریکہ کے آگے سر نہ اٹھا سکنا ایسے عوامل ہیں جنہوں نے خطے کی عوام میں غم وغصہ بھر دیا ہے۔ اس وقت مشرق وسطیٰ میں ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو کہ امریکہ اور اسرائیل کے سامنے کھڑا ہونے کے لیے تیار ہو اور احمدی نژاد خود کو ایسا رہنما ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اسی خاطر اس نے ہولوکاسٹ اور اسرائیل کے متعلق فتنہ انگیز بیانات دیے ہیں؛ حزب اللہ کی پشت پناہی کی، فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے مسلم اتحاد پر زور دیا اور اس طرح ایرانی شیعہ ریاست کو عربوں کے لیے موجب رشک بنا دیا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ احمدی نژاد اور اس کے اتحادیوں نے جوہری طاقت کا حصول ایران کے استیصال کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے کیونکہ یہ (جوہری طاقت) خطے میں امریکہ کے عمل دخل کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوگا جو کہ ایک ایسا انعام ہے جس کے حصول کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کم ہے۔ اس مقصد کو عظیم مقصد اور خدائی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔

امریکہ سے بدگمانی کے پیش نظر انتہا پسندوں نے قرار دیا ہے کہ امریکہ کی ایران کے جوہری

پروگرام کی مخالفت جوہری عدم پھیلاؤ کی تحریک نہیں بلکہ ایران کے خلاف اپنے اتحادیوں کی حمایت حاصل کرنے کی چال ہے۔ بقول ایرانی صدر احمدی نژاد ''اگر یہ جوہری مسئلہ حل ہوگیا تو امریکہ انسانی حقوق کا مسئلہ سامنے لے آئے گا اور اگر انسانی حقوق کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو پھر شاید جانوروں کے حقوق کا مسئلہ سامنے لے آیا جائے گا''۔

اپنی ان عجیب وغریب حرکات کے باعث احمدی نژاد گزشتہ دوسالوں سے بین الاقوامی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ ایران میں نئے قدامت پسندوں کے اندر بننے والا ایک اہم گروہ عالمی مشاہدے میں نہ آ سکا۔ یہ قدامت پسند، قومیت کو مذہبیت پر اور عمل پسندی کو نظریات پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس دھڑے میں علی لاریجانی شوریٰ عالیٰ امنیتِ ملی، ایرانی بحری فوج کے سربراہ عباس مختاج، نشریاتِ عامۂ اسلامی جمہوریہ ایران کے امیر عزت اللہ زرکانی شامل ہیں۔

یہ تمام قوم پرست بھی ایران عراق جنگ کی ہی پیداوار ہیں۔ مگر انہوں نے جنگ سے کچھ مختلف نتیجے اخذ کیے۔ ۹۰ کی دہائی میں جب ایران کے مختلف ریاستی ادارے مصلحین کے زیر اثر آ گئے تو ان قدامت پسندوں نے ایران کے بین الاقوامی تعلقات کی پھر سے جانچ کے لیے تحقیق کے مراکز، بالخصوص جامعۂ امام حسین میں پناہ لی جہاں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سرد جنگ کے خاتمے اور ایران کے غیر معمولی جغرافیائی مقام نے اسے قدرتی طور پر خطے کی طاقت بنا دیا ہے اور ملک کی ترقی کے عمل کی راہ میں حکومت کی انتہائی نظریاتی سوچ اور مغرب سے غیر ضروری مخالفت آڑے آ رہی ہے۔ ایران کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے صرف ایک راستہ بچا ہے کہ عقل وفہم سے کام لیا جائے۔ یعنی اپنے اثر ورسوخ کے پرچار کو کم کیا جائے، عالمی قواعد وضوابط کی پاسداری کی جائے اور حریفوں کے ساتھ مصالحت اور ضبط طلب معاملات پر بات چیت کے ذریعے کسی معاہدے پر پہنچا جائے۔

گزشتہ دوسالوں میں اس حقیقت پسند گروہ کے کچھ اراکین کو قومی سلامتی کونسل اور ملک کے دوسرے بڑے اداروں میں کافی اختیارات حاصل ہوئے ہیں۔ روایتی مذہبی حلقوں سے اپنے روابط کو استعمال کر کے وہ ایران کے عالمی تعلقات کی باگ دوڑ جنگجوؤں سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے

ہیں۔

۲۰۰۶ء میں ایران میں مقامی حکومت کے انتخابات کی اہم بات یہ نہ تھی کہ احمدی نژاد کی جماعت کو شکست ہوئی اور مصلحین کی تحریک کی واپسی ہوئی بلکہ یہ کہ ان نئے قدامت پسندوں کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔

ان دو گروہوں کو تقسیم کرنے والے عوامل میں ''امریکہ کے ساتھ تعلقات'' سب سے زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔ حقیقت پرست کہتے ہیں کہ ایران کی خطے میں بالادستی امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات سے اور مستحکم ہوگی۔ لاریجانی نے ۲۰۰۵ء میں کہا: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ ہمارا دشمن ہے، مگر دشمن کے ساتھ مل کر کام کرنا بھی حکمت عملی اور سیاست کا حصہ ہے''۔ انہوں نے کہا کہ خدشات کو دور کرنا اور تعلقات کو معمول پر لانا کافی حد تک سودمند ہوسکتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ امریکہ کی مشرق وسطی میں دخل اندازی کم ہو رہی ہے اور جلد ہی اسے مشرق وسطی سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ مگر پھر بھی امریکہ ایران کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے جو کسی طرح بھی ایران کے مفاد میں نہیں ہے۔ امریکہ کے ساتھ اچھے تعلقات ایران کے خطے میں اثر ورسوخ کو بڑھانے کی راہ ہموار کریں گے۔

اعتدال پسند قدامت پسندوں کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ خطے میں غلبہ پانے کے لیے جوہری طاقت کا ہونا اشد ضروری ہے۔ نائب سربراہ اعلیٰ قومی کونسل علی حسینی تاش کے بقول ''جمہوری پروگرام کی صورت میں ہمارے پاس ایک ایسا موقع ہے جس کے تحت ہم خطے میں اہم حیثیت حاصل کرلیں گے اور خطے میں اپنی قوت ووقار کو بھی بلند کر پائیں گے۔ مگر اعتدال پسند ضبط پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ وہ جوہری عدم پھیلاؤ کے معاہدے کی پاسداری اور عالمی برادری کے ساتھ بھروسے کی فضا قائم کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔ انہیں امید ہے کہ واشنگٹن کے ساتھ بہتر تعلقات ایران کے ایٹمی منصوبے کے بارے میں اس کے خدشات کو بھی کم کریں گے اور انہیں جوہری پروگرام ترک بھی نہیں کرنا پڑے گا کہ امریکہ کے ساتھ مذاکرات کرنا چاہیے۔

اس کھینچا تانی کے سبب مخمصے میں پڑے ہوئے ایرانی راہنماء اعلیٰ نے ابھی تک عمل پسندوں کے

موقف کی کسی حد تک حمایت کی ہے۔ایک طرف تو امریکہ کے ساتھ بدگمانی رکھنے والے سخت نظریات کے حامل خامنہ ای احمدی نژاد کی مغرب سے کھلی مخالفت اور اسلام پرستی میں اس کی حمایت کرتے ہیں، دوسری طرف انہی قدامت پسندوں کے ساتھ خامنہ ای کے تعلقات کسی دور میں بھی خوشگوار نہیں رہے۔

اسلامی جمہوریہ کی اس بے رحم سیاست میں اپنی بقا کے لیے خامنہ ای نے دونوں گروپوں میں توازن برقرار رکھا ہے اور کسی ایک گروپ کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ابھی تک تو حقیقت پسند خامنہ ای کو باہمی خدشات پر مذاکرات کے لیے راضی کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں تاہم ایران کا سیاسی منظر نامہ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔

عراق میں امریکہ کی بڑھتی ہوئی ناکامیاں، حزب اللہ کی اسرائیل کے خلاف فتح اور احمدی نژاد کی طرف سے سرکش جوہری حکمت عملی کی کامیابی ان لوگوں کے موقف کو درست ثابت کرتی ہے جو امریکہ سے مخاذ آرائی کی سیاست پر یقین رکھتے ہیں۔اسی غیر یقینی صورتحال کے پیش نظر رہبر معظم ایران کے اندر ہونے والی ان بحثوں کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

اتحاد کا راستہ

اس غیر یقینی صورتحال سے نمٹنے کے لیے (واشنگٹن) امریکہ کو ایک ایسی حکمت عملی پر عمل کرنا ہوگا جو بظاہر تصوراتی معلوم ہوتی ہے۔اسے محض حکمت عملی بدلنے کی نہیں بلکہ اپنے اندازِ فکر کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

روکنے کی پالیسی کے نظریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے امریکی پالیسی ساز عرصہ دراز سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مذاکرات کا ختمی نتیجہ حالات کا معمول پہ آجانا ہے۔مگر اس نئی حکمت عملی میں ''تعلقات کا معمول پر آنا'' حرفِ آغاز ہوگا جس سے جوہری ہتھیاروں اور دہشت گردی جیسے نازک معاملات پر مذاکرات کا راستہ ہموار ہوگا۔صرف دفاعی اور معاشی شعبوں میں باہمی تعاون کا گہرا جال

ہی ایران کو خطے کی غیر مبدل صورتحال کو برقرار رکھنے کے لیے مجبور کرسکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک ایسی صورتحال پیدا کی جائے گی جس میں تہران کے واشنگٹن سے تعلقات اس کو حزب اللہ سے گٹھ جوڑ اور جوہری ہتھیاروں کی جستجو سے کہیں زیادہ عزیز ہوں گے۔

اس قدر بڑے پیمانے پر تبدیلی لانے کے لیے امریکہ کو عمل پسندوں کے ہاتھ مضبوط کرنے ہوں گے۔ انہیں پابندیوں سے چھٹکارا اور ان کے ساتھ اچھے تعلقات کی یقین دہانی کرانی ہوگی۔ واشنگٹن کی طرف سے ایران کی خطے میں حیثیت کو تسلیم کرنا اور مغرب کے ساتھ گہرے معاشی تعلقات شاید حقیقت پسندوں کو اس قابل کردیں کہ وہ تہران میں اپنی جگہ بنا سکیں اور خامنہ ای کو اس بات پر راضی کرسکیں کہ امریکہ کے ساتھ محاذ آرائی پر یقین رکھنے والے غلطی پر ہیں۔

''تہران کو واشنگٹن کی طرف سے اپنی سلامتی کی ضمانت چاہیے''۔

نئی حکمت عملی کے تحت امریکہ کو اپنی اس سوچ کو بھی ترک کرنا پڑے گا کہ امریکی پالیسی ساز ہر صورت میں صحیح منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی ہی پالیسی کو ایران کے مسئلے کے حل کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر بش انتظامیہ ایران پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کرے تو اس مسئلے کا حل ممکن ہے۔ اسلامی جمہوریہ خطے میں اپنی طاقت کو کس انداز سے دیکھتا ہے؟ مذہبی حکومت کے سرپرست امریکہ سے نہیں ڈرتے۔ نہ ہی اپنی جنگی کمزوری کی وجہ سے عالمی برادری کی طرف دیکھتے ہیں۔

وہ امریکہ سے ان پر حملہ نہ کرنے کی ضمانت نہیں چاہتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ خطے میں ان کی اہمیت و حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ بیشک امریکہ کو اپنے رویے اور لائحہ عمل میں بڑی تبدیلی لانی ہوگی۔ مذہبی نوعیت کی حکومت امریکہ سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ ایران کو ایک امن پسند آزاد اور خودمختار ملک تسلیم کرتے ہوئے مذاکرات کی میز پر آئے اور ساتھ ہی مذاکرات کی پیشکش بھی کرے۔

ہر حریت پسند اور انقلابی قوم کی طرح ایران کی بھی یہی خواہش ہے کہ عالمی برادری نہ صرف اس کے مفادات بلکہ آزادی اور خودمختاری کا بھی احترام کرے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ روسی رہنماؤں کا تھا جو

چاہتے تھے کہ امریکہ جنگ کے بعد کی یورپی حد بندی کو تسلیم کرے۔ ایران کے علماء کوئی عجیب کام نہیں کر رہے۔ نئی ایران پالیسی کے تحت امریکہ کو سرکاری طور پر ایران کی طاقت کو ماننا پڑے گا۔

اسی جذبے کے تحت واشنگٹن کو حکومت تبدیل کرنے کی مایوس کن پالیسی ترک کرنی ہوگی۔ بشمول ایرانی جلاوطنوں اور ان کی داستانیں ایران میں نشر کرنے پر سالانہ ۷ کروڑ پچاس لاکھ ڈالر خرچ ایک طرف تو غیر ضروری ہے کیونکہ ایران کا معاملہ مغربی یورپ سے مختلف ہے۔ یہاں پر کوئی حزب اختلاف نہیں ہے جو امریکہ سے فنڈز (مالی امداد) اور ہدایات لے۔ دوسرا حکومت کی تبدیلی کے نعرے کا الٹا اثر ہوا ہے۔ امریکہ کی طرف سے ایرانی حکومت کی علامت اور مفقود الوجود جمہوری حزب اختلاف کی مالی امداد نے بہت سارے قدامت پسندوں کو یہ تاثر دیا ہے کہ امریکہ جو مذاکرات کی پیشکش کر رہا ہے وہ صرف تہران حکومت کو نیچا دکھانے کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعتدال پسندوں کی جانب سے کسی بھی مرحلہ پر امریکہ کے ساتھ کسی طرح کی مفاہمت کی کوشش کو شیطان کی چالوں کا ساتھ دینے کے مترادف قرار دیا گیا۔ ایران تبدیل ضرور ہوگا مگر اپنی شرائط پر اور اپنی رفتار میں۔ امریکہ کی خواہش ہے کہ وہ تہران میں اعتدال پسند حکومت لائے مگر جلاوطنوں کی داستانیں نشر کرنے اور لاتعلق عوام سے فریاد کرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ ایران کی عالمی معیشت میں شمولیت اس سے کئی گنا زیادہ موثر ہوگی۔

راہ ورسم کے تقاضے

ایران کے ساتھ راہ ورسم کو موثر انداز میں بڑھانے کے لیے امریکہ کو نازک معاملات پر ایران سے براہ راست مذاکرات کرنے ہوں گے۔ یہ مذاکرات چار مراحل میں ہونگے، کیونکہ مذاکرات کا بنیادی مقصد تعلقات کو معمول پر لانا ہے۔ پہلے مرحلے میں اسے سفارتی تعلقات بڑھانے، معاشی پابندیوں کو بتدریج ختم کرنے اور منجمد اثاثوں کی واپسی کا نظام العمل دینا ہوگا، کیونکہ اس طرح کے معنی خیز اقدامات ہی اہم فیصلوں کی راہ ہموار کریں گے۔ اور عوام میں امریکہ کے متعلق خیر خواہی کے جذبات بڑھائیں گے۔

ایران کی جوہری سرگرمیوں میں اضافے کے پیش نظر یہ مسئلہ دوسرے مرحلے میں زیر بحث آئے گا۔ یہ نظریہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران لیبیا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا جوہری منصوبہ تلف کر دے گا۔ اس تنازع پر مذاکرات کرنے والوں کے ذمہ یہ کام ہوگا کہ ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس کے تحت ایران عالمی برادری کا اعتماد حاصل کر سکے، مثلاً سخت معائنہ کرایا جائے اور ثابت کیا جائے کہ جوہری سرگرمیاں پرامن مقاصد کے لیے ہیں اور ان کو فوجی مقاصد کے لیے تبدیل نہیں کیا جا رہا۔ ایران کو این پی ٹی حقوق کے تحت چھوٹے پیمانے پر یورینیم کی افزودگی کی اجازت دی جائے۔ بدلے میں ایران کو فوری معائنہ، آئی اے ای اے کے نمائندے کی مستقل تعیناتی اور گزشتہ سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلی آگاہی جیسی جانچ پڑتال کی کارروائیوں کی اجازت دینی ہوگی۔ یقیناً ایران کا ختمی منصوبہ ایٹمی توانائی کا حصول ہی ہوگا مگر عراق کے معاملے سے ثابت ہوتا ہے کہ انتہائی تفصیلی معائنے اور سخت نگرانی اس اولوالعزمی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ تیسرے مرحلے میں مذاکرات عراق پر ہوں گے۔

بیکر ہملٹن رپورٹ کے مطابق بہت سے امریکی پالیسی ساز اور پنڈت اس بات پر مصر ہیں کہ ایران عراق میں مددگار ثابت نہیں ہوسکتا۔ یہ خیال گمراہ کن ہے۔ پہلی فرضی کہانی یہ ہے کہ تہران چاہے گا کہ امریکی فوج عراق میں ہی پھنسی رہے کیونکہ بڑھتی ہوئی خونریزی اسے خوفزدہ کرنے کے علاوہ اس کے حوصلے پست کرے گی اور وہ ایک اور آفت اپنے سر لینے سے گریز کرے گا۔ دراصل چار سالہ غیر نتیجہ خیز جنگ سے ایرانیوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ امریکہ کے سلطنت بنانے کے عزائم کافی معدوم ہو چکے ہیں اور اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ عراق کے معاملے میں ایران کی امداد حاصل کرنے کا مطلب ایران کے خلاف اقوام متحدہ کی قرارداد کو ملتوی کرنا ہوگا۔ یہ بات ایسے کہی جا رہی ہے جیسے کہ اقوام متحدہ کی لگائی پابندیاں واقعی کارگر ہیں جنہیں ملتوی کرنے سے کوئی نقصان ہو جائے گا۔ اس کے برعکس ایرانی رہنماء اپنے جوہری پروگرام کو عراق کے تناظر میں ہرگز نہیں دیکھتے۔ امریکی فوجیوں کی عراق میں موجودگی اس کے سیاسی استحکام کی راہ میں حائل ہے۔ عراق صرف اسی

صورت مستحکم ہوسکتا ہے اگر امریکی افواج عراق سے نکل جائیں۔ بہرحال تہران کے جو بھی عزائم و نظریات ہوں عراق میں اس کا اثر ورسوخ اسے ناگزیر شراکت دار بناتا ہے۔

فی الوقت ایران شیعہ اتحادی جماعتوں کی کامیابیاں بڑھانے اور مزاحمت کاروں کو اسلحہ دینے اور واشنگٹن جوابی کارروائی کے طور پر الزام تراشی میں مصروف ہے۔ تاہم دونوں ممالک کے کچھ مشترکہ مفادات بھی ہیں۔ واشنگٹن کی طرح تہران بھی خانہ جنگی کا خاتمہ چاہتا ہے اور عراق کا اتحاد برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

ایرانی رہنماء سمجھتے ہیں کہ عراق میں اپنے مقاصد کا حصول ایسے انتخابات کے ذریعے ہی ممکن ہے جن کے نتیجے میں شیعہ جماعتوں کا اقتدار میں آنا یقینی ہے۔ ایک مستحکم عراق ہی امریکی افواج کے انخلا کا سبب بنے گا۔ مزاحمت کاروں کا خاتمہ ہوگا اور اعتدال پسند سنیوں کو آگے آنے کا موقع ملے گا۔ یہ تمام ایسے اہداف ہیں جو دونوں ممالک کے مشترکہ مفادات میں شمار ہوتے ہیں۔

عراق میں ایرانی دخل اندازی پر آہ وزاری کرنے کی بجائے امریکی پالیسی سازوں کو اسے ایک ازمائش کے طور پر لینا چاہیے کہ اس اثر ورسوخ کا تعمیری استعمال کیسے ممکن ہے۔ ایک دفعہ ایران کے اثر کو جائز قرار دے کر امریکہ اپنے مطالبات اس سے پورے کرا سکتا۔ پھر امریکہ ایران پر دباؤ ڈال سکتا ہے کہ عراقی شیعوں کو پرامن رکھے یعنی انہیں مزاحمت سے باز رکھے اور مقتدیٰ الصدر جیسے اشتعال پسند کرداروں کو لگام دے۔ مزید برآں ایران آج عراق کے ساتھ تجارت کرنے والے ممالک میں سر فہرست ہے۔ امریکہ کو چاہیے کہ اس تجارت میں سہولت پیدا کرے کیونکہ اس طرح جنوبی عراق مستحکم ہوگا۔ جتنا جلد امریکہ اس بات کا ادراک کرے کہ ایران عراق میں ایک اہم کردار ادا کرسکتا ہے، اتنا ہی بہتر انداز میں امریکہ عراق کو ٹوٹنے سے بچا سکتا ہے اور خلیج فارس مزید عدم استحکام سے بچ سکتا ہے۔

سب سے کانٹے دار مرحلہ وہ ہے جس میں اسرائیل اور فلسطین کے تنازع پر بات چیت ہوگی۔ کیونکہ ایران اسرائیل کا کھلا مخالف ہے اور اسکے خلاف اکثر اوقات دہشت گردوں کی پشت پناہی بھی کرتا ہے۔ ایران کی اسرائیل سے دشمنی اسلامی نظریات کی بنیاد پر ہے جو کہ اسرائیل کو ایک آزاد مملکت

کی حیثیت نہیں دیتا (بلکہ اسے امریکہ کا ایک بیرونِ ملک اڈہ سمجھتا ہے)۔ امریکہ کو ایران کے اس موقف میں تبدیلی لانا ہوگی۔ اگر ایران امریکہ تعلقات معمول پر آجائیں تو ایران کے اسرائیل کی طرف جارحانہ عزائم کے پیچھے اصل مقصد باقی نہیں رہے گا۔

اگر ایرانی تاریخ کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ایران کے رویے میں مثبت تبدیلی بھی ممکن ہے۔ مثال کے طور پر نوے کی دہائی میں چند صحیح پیش کشوں سے تہران کو قائل کرلیا گیا تھا کہ وہ یورپ میں موجود اپنے ایرانی نژاد مخالفین کو قتل کرنے اور خلیج فارس میں چند دہشت گردوں کی پس پردہ مدد سے باز رہے۔

۱۹۹۷ء میں ایک جرمن عدالت نے ایک ایرانی اہلکار کو پانچ سال پہلے ہونے والے حزب مخالف رہنماء کے میرین کے ایک ہوٹل میں ہونے والے قتل میں مجرم ثابت کیا۔ بڑے یورپی ممالک نے ایران میں اپنے سفارت خانے بند کردیئے اور تجارت پر پابندی لگادی۔ اسلامی جمہوریہ نے فوراً بیرون ملک اپنی تمام غیر قانونی سرگرمیاں بند کردیں۔ اسی طرح جب سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں نے ایران کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ ایران ان ممالک میں شدت پسندوں کی معاونت ترک کردے تو ایران نے تعاون کیا۔ مفاہمت اور مصالحت کے فوائد نے ایران کو گویا اپنے رویے میں مثبت تبدیلی پر قائل کیا۔

واشنگٹن کو بھی اس فلسفے پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ جوں ہی امریکہ اور ایران اپنے باہمی تنازعات کے حل کی طرف بڑھیں گے حالات کا قدرتی بہاؤ تہران کو مشرق وسطیٰ امن منصوبہ کی دہشت گردی پر انحصار سے بہت دور لے جائے گا۔ حکمت عملی میں اس تبدیلی کو بہتر سفارتی و معاشی تعلقات سے مزید مضبوط کیا جاسکتا ہے۔

مقصد تہران کو حزب اللہ کی پشت پناہی سے باز رکھنا نہیں بلکہ اس پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ حزب اللہ کو لبنانی سیاست میں تعمیری کردار ادا کرنے اور اسرائیل پر حملے نہ کرنے پر راضی کرسکے۔

تقریباً تین دہائیوں سے شدت جذبات اور غیر ذمہ دار بیان بازی امریکہ اور ایران کے مابین

حقیقت پسندانہ تعلقات کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ بہت دفعہ حقیقت پسندی کو نظریات پر قربان کر دیا گیا۔

تاہم آج ایران میں ایک ایسا گروہ موجود ہے جو امریکہ کیساتھ افہام وتفہیم کے ساتھ راہ رسم بڑھانے کو تیار ہے۔ جواباً واشنگٹن کو مفاہمت کی ایک جامع حکمت عملی وضع کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے اسی طرح امریکہ ایران میں دوطرفہ عداوت پر قابو پایا جاسکے۔

اس نئے ڈھانچے میں بھی کشیدگی یا تصادم خارج از امکان نہیں لیکن پھر بھی تہران کو قائل کیا جاسکتا ہے کہ شدت پسندانہ سرگرمیوں کو ترک کر دینا ہی اس کے مفاد میں ہے۔ ایران امریکہ کے لیے ایک مستقل مسئلہ تو رہے گا تاہم دیکھنا یہ ہے کہ آیا امریکہ ایران تعلقات معمول پر لانے اور اہم مسائل پر مذاکرات کی پیشکش ایران کو یہ سوچنے کا موقع دے گی کہ اسے ایک ایسی قوم بننا ہے جو اپنے جائز حقوق کا تحفظ کرسکتی ہے یا پھر ایک ایسی قوم جو خود ساختہ سراب کا پیچھا کرنے والی ہو۔ ایک طویل عرصے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ایران اولذکر رویے کا انتخاب کرے گا۔